حمیدہ اختر حسین (رائے پوری)

پریم بدا دیوی

[...] رات کو مولوی (عبد الحق) صاحب نے بتایا کہ ''شام کو سروجنی نائیڈو کا ڈرائیور ان کے نام کا ایک پرچہ دے گیا تھا۔ انھوں نے تم کو کل لنچ پر بلایا ہے جس کے لیے مجھ سے اجازت طلب کی ہے۔ دیکھو کیسی چالاک ہیں کہ اختر [حسین رائے پوری] سے نہیں کہا۔ ان کی موٹر کل گیارہ بجے لینے آئے گی۔ چلی جاؤ تو ٹھیک ہے اور نہ جانا چاہو تو موٹر واپس کر دینا۔'' میں سوچنے لگی کہ یہ کیا بات ہوئی۔ ہم دونوں تو ہر جمعے کو بابا کے ہاں جاتے ہیں اور ان سے بھی ملاقات ہوتی ہے۔ کیسی وضع دار ہیں۔ اختر سے نہ پوچھ کر مولوی صاحب سے اجازت چاہی کہ گھر کے بڑے وہ ہیں۔ پوچھا، ''آپ کی اگر رائے ہو تو چلی جاؤں۔'' خوشی سے اجازت دے کر بولے، ''بھئی تمھاری زندگی کا ہر روز شام تک یوں گزرتا ہے، برآمدے سے کمرے میں یا کمرے سے برآمدے میں۔''

منگل کی صبح گیارہ بجے موٹر مجھے لینے آئی۔ میں ان کے ہاں چلی گئی۔ وہ مجھے باغ میں گشت کرتی مِل گئیں۔ اندر اپنی اسٹڈی میں بٹھایا اور بیرے سے کہا شربت کے دو گلاس دے جائے اور اگر کوئی ملنے آئے تو ''کہہ دینا میم صاحبہ گھر پر نہیں ہیں۔'' صوفے کے ایک طرف اپنے پاؤں اوپر کر کے پَھسکڑا مار کر بیٹھ گئیں۔ مجھے بھی صوفے پر اپنے نزدیک بٹھا کر کہا، ''بھئی تم بھی پاؤں اوپر کر کے آرام سے بیٹھ جاؤ۔'' ان کے پاس میز پر ایک پھول دان میں تازہ تازہ مختلف طرح کے پھول، چند ہری ہری ڈنڈیاں مع پتّوں کے اور کچھ سوکھی ٹہنیوں کی پتلی ڈنڈیاں، کچھ اونچی، کچھ ادھر کو جھونک کھاتی ہوئی جاپانی سی، لگی دیکھ کر سوچا یہ آج انھوں نے خود سجایا ہے۔ ورنہ کسی مالی یا نوکر کے بس کی تو یہ سجاوٹ ہو ہی نہیں سکتی۔ بیرا شربت کی ٹرے لے آیا تو اس سے کہا، کمرے کا دروازہ بند کر دے۔ پھول دان کے پاس بہت سے خطوط انگریزی میں لکھے، جو خاصے پرانے لگ رہے تھے۔ روشنائی پھیکی پڑ چکی تھی۔ ان خطوط پر ہاتھ رکھ کر بولیں، ''حمیدہ، آج میں بڑی عجیب سی سچّی کہانی سناتی ہوں۔ یہ کہاوت سچ معلوم ہوتی ہے کہ ڈھونڈنے والے کو خدا بھی مل جاتا ہے۔ تم کو جس بات کے معلوم کرنے کی سخت جستجو تھی وہ آج

تم کو معلوم ہو جائے گی۔ تو لو، سنو:

''تم کو تو یہ معلوم ہے کہ میری تعلیم آکسفورڈ یونیورسٹی میں ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ لڑکیاں تو کجا لڑکے بھی بہت کم ہی ہندوستان سے انگلستان پڑھنے جاتے تھے۔ مجھے وہاں پہنچ کر اپنے ملک اور گھر کی یاد بری طرح ستانے لگی۔ کلاس میں نہ کوئی ہندوستانی لڑکی تھی نہ کوئی لڑکا۔ میری طرف ہر کسی کی نظریں یوں اٹھتیں جیسے میں کوئی عجوبہ شے ہوں۔ بڑا ناگوار لگتا۔ ہوسٹل میں‌بھی بس ایک میں ہندوستانی لڑکی تھی۔ تیسرے دن ایسا ہوا کہ ہمارے پروفیسر کے ساتھ ایک بنگالی لڑکی، دبلی پتلی، چمپئی رنگت، تیکھے ناک نقش، لمبا قد، بڑا سا جُوڑا باندھے، بندیا لگائے، پُروقار چال کے ساتھ ہمارے کلاس روم میں ان کے ساتھ ساتھ داخل ہوئی۔ سارے طلبہ کی نگاہیں ان پر ٹِک سی گئیں۔ ہم سب کو یہ کہہ کر بلوایا کہ یہ پریم بدا دیوی ہیں، بنگال سے تعلّق رکھتی ہیں اور سروجنی کی طرح یہ بھی شاعرہ ہیں اور سیاست سے بھی بہت گہرا لگاؤ ہے۔ پھر کیوں نہ ان کو سروجنی کے برابر والی کرسی دے دی جائے۔ ایک لڑکے کو اٹھوا کر برابر کی کرسی ان کے لیے خالی کروادی اور اپنی جگہ آکر لیکچر دینا شروع کردیا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو سر تا پاؤں دیکھنے کے بعد لیکچر سننا شروع کردیا۔

''کمرے سے باہر نکل کر ہم یوں باتیں کرنے لگے جیسے ہمیشہ سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ میرے کمرے میں ایک پلنگ خالی تھا۔ اس لیے پریم بدا کو اپنے کمرے میں رکھ لیا۔ کبھی ہم دونوں اپنے مضمون کی باتیں کرتے کبھی اپنے دیس کی۔ ہم دونوں ہی کو سیاست سے گہری دلچسپی تھی، انگریز سے نفرت بھی ساتھ ہی اس کی خوبیاں بھی ہماری نظر میں تھیں کہ یہ اپنے ملک، اپنی قوم اور اپنی زبان پر کس قدر نازاں ہیں۔ محنت، عزم اور عِلم کے بَل بوتے پر آدھی دنیا پر حکومت کر رہے ہیں۔ پریم بدا کی ذہانت اور قابلیت سے میں چند روز ہی میں مرعوب ہوگئی۔ میں تو صرف ایک شاعرہ تھی اور یہ بڑے پائے کی ادیب بھی۔ ہر ہفتے دو چار بنگلہ کے اخباروں کے لیے مضمون لکھ کر بھیجا کرتیں۔ مختلف رسالوں کے لیے نظمیں۔ یہ انگریزی اور بنگلہ دونوں زبانوں میں لکھا کرتیں۔ مجھے دل میں بڑی شرم آتی کہ میں اب تک صرف انگریزی ہی میں لکھتی رہی ہوں۔

''پریم بدا اپنے ماں باپ، جو لکھ پتی تھے ان کی اکلوتی بیٹی ہونے کی وجہ سے بجائے کوئی غرور، ٹھپّا، نخرہ یا اتراہٹ کے انداز لیے ہوے محسوس ہوتیں، اس کے برعکس سادہ

مزاج، نفاست پسند، سادگی کے ساتھ لیے دیے، پروقار شخصیت کی حامل تھیں اور میں ڈھیر سے بہن بھائیوں اور درمیانہ طبقے سے تعلق رکھنے والی ان جیسی نہ تھی۔

ہم دونوں آکسفورڈ یونیورسٹی میں نمایاں جگہ اپنی تقاریر اور پوئٹری کی وجہ سے پا گئے۔ وہاں کے اسٹیج ڈراموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے اور مباحثوں کے موقعے پر ہم دونوں کا پلّہ بھاری رہتا۔ ہماری دوستی کی گہرائی کی کوئی حد نہ تھی۔ دو سگی بہنوں میں بھی ایسی محبت شاید نہ ہوسکے جو ہم دونوں کے درمیان تھی۔ وہ پیار ہم دونوں میں آج تک اسی طرح ہے۔ ہم دونوں نے نمایاں کامیابی سے بی۔ اے۔ کر لیا۔ پریم بدا ہندوستان کے لیے اور میں چار ماہ یورپ کی سیر کی نیّت سے روانہ ہوگئی۔ اس چار ماہ کے دوران ہم دونوں کی خط و کتابت نہ ہوئی۔ جب میں واپس گھر آئی تو پریم بدا کا ایک موٹا سا خط میرے نام آیا رکھا ملا، جس میں لکھا تھا کہ دورانِ سفر ان کی ملاقات رائے بہادر تارا ناتھ بنرجی سے ہوئی اور دونوں کو کسی مقناطیسی طاقت نے ایک دوسرے کی طرف کھینچ لیا۔''

بنرجی نام پر میں چونک پڑی۔ اب بڑی توجّہ سے ان کی سچّی کہانی سننے لگی۔ وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو بیٹھیں۔ مجھ سے نہ رہا گیا، پوچھا،''ہاں تو پھر کیا ہوا؟'' ان کی نگاہیں خلا میں جیسے کچھ دیکھ رہی تھیں اور اداسی صاف نظر آرہی تھی۔ ذرا چونک پڑیں اور مجھے بتانے لگیں کہ ''پریم بدا نے مجھے لکھا کہ تارا ناتھ بنرجی خود بھی بیرسٹر ہیں اور اپنے والد بیرسٹر رائے بہادر سر آسوتوش بنرجی جو کافی عرصہ کلکتہ یونیورسٹی میں وائس چانسلر بھی رہ چکے ہیں، ان کی جَمی ہوئی پریکٹس میں شامل ہو کر کام کرتے ہیں۔ یہ بھی اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے ہیں۔ چند بار ہم دونوں کی ملاقات ہوئی اور یہ فیصلہ کر لیا کہ شادی کریں گے۔ میں تو چاہتی تھی کہ شادی تمھاری واپسی پر ہو، مگر تارا ناتھ بنرجی کو بہت عجلت تھی کہ شادی جلد سے جلد ہو جائے۔ میرے والدین نے یہ رشتہ خوشی خوشی منظور کر لیا۔ تین ماہ قبل ہم دونوں کی شادی ہو گئی۔ تم جلد کلکتہ آؤ، ان سے ملو تو یقیناً میرے انتخاب کی داد دوگی۔ فی الحال تو میں تم سے اتنا ہی کہوں گی کہ ہم ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ ایک دوسرے کو پورے طور سے سمجھتے ہیں اور پورا بھروسہ رکھنے کی وجہ سے ہر ہر منٹ خوش اور مگن ہیں۔''

اس خط کو ایک طرف رکھ کر دوسرا خط ہاتھ میں اٹھا لیا۔

''کچھ ہی ہفتوں بعد میں کلکتہ گئی۔ تاراناتھ سے مل کر دل خوش ہی تو ہوگیا۔ بڑے خوش شکل، روشن دماغ، بامذاق شخصیت کے مالک۔ کانگریس کی میٹنگ میں شرکت کر کے واپس حیدرآباد آئی اور چند ماہ بعد میری بھی شادی ہو گئی۔

''میری دوست اس خط میں اطلاع دیتی ہیں کہ خدا نے ان کو چاند سا بیٹا دیا ہے جس کا نام منوہرناتھ بنرجی رکھا ہے۔ پھر بڑے اصرار سے مجھے کلکتہ آنے کو لکھا، مگر میں تو خود بچے کی ماں بننے والی تھی، کافی طبیعت خراب رہتی تھی۔ سفر کر ہی نہ سکتی تھی۔ پریم بدا دو ماہ کا اپنا پیارا گڈّا سا بیٹا لے کر آئیں۔ ایک ہفتے رہ کر واپس کلکتہ چلی گئیں۔ اس دوران انھوں نے مجھے بتایا کہ بنرجی صاحب آج کل اردو، فارسی بڑے زور شور اور شوق کے ساتھ سیکھ رہے ہیں۔ ان کو اپنے کیسوں کے سلسلے میں اکثر اردو سے واسطہ پڑتا ہے تو بہت شرمسار ہوتے ہیں کہ وہ اپنے دیس کی دوسری سب سے بڑی زبان سے بے بہرہ ہیں۔ فارسی ساتھ ہی ساتھ یوں شروع کردی تاکہ اچھی قسم کی اردو پر مہارت حاصل کر سکیں۔ ان کا خود بھی ارادہ ہو رہا ہے کہ بس بچہ ایک سال کا ہو لے تو وہ بھی اردو سیکھنا ضرور شروع کر دیں گی۔

''یوں چند سال گزر گئے۔ ہم دونوں اپنی اپنی جگہ آزاد پنچھی تھیں۔ دونوں کو ہی شوہر ایسے ملے کہ ان کو ہماری کسی بات پر کوئی اعتراض ہی نہ تھا۔ ہم دونوں کبھی دہلی کبھی بمبئی گاہے مدراس، کبھی الہ آباد یا کلکتہ کی ہر کانگریس کی میٹنگس میں شرکت کرتے۔ یوں جلد جلد ایک دوسرے سے ملاقاتوں کا سلسلہ رہتا اور خط و کتابت تو ہوتی ہی رہتی۔ پریم بدا اپنی بنگا لی کی نظموں کا گاہے گاہے انگریزی میں ترجمہ کر کے بھیج دیتیں۔ مجھے لوگ 'بلبلِ ہند' کے نام سے پکارنے لگے تھے۔ میں یہی سوچا کرتی کہ پریم بدا کے سامنے تو کچھ بھی نہیں۔ پھر جب ان کو 'سحرِ بنگالہ' کا خطاب دیا گیا تو میں پریم بدا سے زیادہ ہی خوش ہوئی۔

''بابا کو تم نے دیکھ ہی لیا ہے۔ جب یہ چھوٹا تھا، خوب گول مٹول، پیٹ بھر کالا۔ موٹے موٹے ہونٹ، پکوڑی سی ناک، مگر آنکھوں میں بَلا کی ذہانت، جگنو جیسی چمک، ہم دونوں جب یکجا ہو جاتے عجیب تضاد نظر آتا۔ منوہرناتھ ایک نازک، تیکھے نقش و نگار کا گورا چٹا سا لڑکا تھا۔ یوں دو سال اور گزر گئے۔ دونوں لڑکے پڑھنے بٹھا دیے گئے۔ اس خط میں میری دوست نے لکھا ہے: سنٹرل انڈیا میں کوئی ریاست 'سکتی' ہے، وہاں کے راجا کے

اکلوتے بیٹے سے کسی کا خون ہوگیا۔ بندوق کسی اور کی اور وہ بھی بِلا لائسنس تھی۔ انگریز کے اس دور میں انصاف ہر ایک کے لیے یکساں ہوا کرتا۔ ولی عہد پر مقدمہ دائر ہوگیا۔ بڑے بیرسٹر صاحب (سر آسوتوش بنرجی) کو کلکتہ سے مقدمے کی پیروی کے لیے راجا صاحب نے لکھا تو انھوں نے یہ کہہ کر کہ وہ فی الحال چند بڑے مقدمات میں ایسے اُلجھے ہوئے ہیں کہ وہ یہ مقدمہ نہیں لے سکتے۔ ہاں ان کا بیٹا تاراناتھ بنرجی جو بیرسٹر ہے، اگر ان کو راجا صاحب وکالت کے لیے بلانا پسند کریں تو وہ آسکتے ہیں۔ راجا صاحب نے ہامی بھر لی اور میرے 'تارا' کو چند ماہ کے لیے روانہ کردیا۔

''اب جو یہ خط آیا کہ 'سروجنی، اس خط کو پڑھ کر تم بھی ہنسی کے مارے لوٹ جاؤگی، جس طرح ''تارا'' کا یہ خط پڑھ کر ہنسی ہوں۔ لکھا ہے، ''تو تم کو بتا چکا ہوں کہ راجا صاحب کے محل کے احاطے میں ایک مہمان خانے میں میری رہائش کا بندوبست کیا گیا ہے۔ ایک سیاہ رنگ کا عربی گھوڑا سواری کو دیا گیا ہے۔ ابھی تک صبح کو میں ہواخوری کے لیے اس طرف کو جاتا رہا جس طرف آگے جا کر پہاڑیوں کا سلسلہ اور جنگلات شروع ہوجاتے ہیں، لیکن اب چند دن سے دوسرا راستہ اختیار کیا ہے جدھر آبادی ختم ہو کر باغات اور کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ کئی دن ہوے کہ آبادی کے ختم ہونے پر ایک بہت بڑی حویلی نظر آئی۔ اس کے پاس آکر گھوڑا رُک گیا۔ سوچا یہاں اس پر کوئی بیٹھ کرآتا ہوگا۔ ایڑ لگانے پر بھی جب اس نے جنبش نہ کی تو میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ اوپر کی طرف میری نظر اٹھی تو کیا دیکھتا ہوں ایک سولہ سترہ سال کی لڑکی اپنے لمبے لمبے بال کھولے سُکھا رہی ہے۔ میں نے لگام کی ڈھیل کو کھینچ لیا اور اوپر کو دیکھتا رہا۔ یوں لگا جیسے کوئی پری کھڑی ہو۔ لگام کو ڈھیل دی، ایڑ لگائی، گھوڑا آگے کو یہ سوچتا ہوا بڑھ گیا کہ اپنے دیس میں کیسی کیسی حسین عورتیں ہیں۔ ساتھ ہی تمھارا سندر مکھڑا آنکھوں کے آگے آگیا۔ دوسرے دن صبح ادھر کا پھر رخ کیا، مگر یقینِ کامل تھا کہ وہ پری جمال آج کیوں چھت پر ہوگی۔ روز روز تو بال سُکھائے نہیں جاتے۔ آج بھی وہ نظر آئی، مگر ہاتھ میں دو کبوتر تھے۔ غور سے دیکھا تو ایک بڑا سا کابک تھا جس کے پاس ہی وہ کھڑی تھی۔ اپنے گالوں کو کچھ دیر ان کے پروں پر پھیر کر اور ہاتھوں کو اوپر کر کے اُڑا دیا۔ دوسرے ہاتھ سے دوسرا کبوتر بھی اڑا دیا۔ گردن اونچی کیے کچھ دیر ان کی اڑان کو دیکھ کر سیڑھی سے اتر کر نیچے چلی گئی اور میں ہوں کہ جب سے صبح کو سیر کے لیے ادھر

ہی سے گزر رہا ہوں اور ایک عجیب سی کیفیت دل پر طاری ہو رہی ہے۔ میری 'پریم' کہیں ایسا نہ ہو کہ میں کسی آزمائش میں پھنس جاؤں اور تم کو کوئی دکھ پہنچا دوں۔'' مجھے ہنسی اس بات پر آئی کہ یہ تاراناتھ ہندوستانی عاشقِ نامراد بن بیٹھنے سے کیسا ڈر رہے ہیں اور مجھے سمجھ رہے ہیں کہ میں جل اٹھوں گی۔ مجھے تو بڑی خوشی ہوئی کہ وہ حسن سے متأثر ہوے۔ یہ تو ہر شخص کا پیدائشی حق ہے۔'

''پھر پریم کے پاس پندرہ دن بعد خط آتا ہے کہ وہ مقدمہ جیت گئے ہیں۔ ' ''راجا صاحب کے قول کے مطابق فیس میں مجھے چاندی میں تولا جائے گا۔ دربار میں ایک جشن رکھنا چاہتے تھے، مگر میں نے شرکت کرنے سے انکار کردیا۔ اس پر راجا یہ سمجھے کہ میں اس فیس کو کم گردان رہا ہوں۔ بڑا اصرار کیا، 'پھر آپ خود بتائیں کہ کیا فیس لینا چاہیں گے؟' جس کا جواب میں نے یہ دیا کی میری منہ ماگی فیس وہ دے نہیں سکتے۔ بہت اصرار کرنے پر میں نے بتایا کہ فلاں حویلی میں ایک لڑکی اس صورت شکل کی رہتی ہے۔ میری شادی اس سے کرادیں۔

'' ' ''راجا صاحب حق حیران رہ گئے کہ وہ حویلی تو ان کے دیوان (پرائم منسٹر) نواب برہان الدین کی ہے اور وہ لڑکی ان کی اکلوتی بیٹی ہے۔ بھلا یہ کیوں کر ممکن ہے کہ ایک صاحبِ حیثیت مسلمان کسی ہندو سے شادی کر دے؟'' راجا صاحب نے ان سے کہا کہ وہ اس بات کا جواب رات کو دیں گے۔ شام کو راجا صاحب خود اٹھ کر نواب صاحب کی حویلی پر گئے۔ ان سے جو بھی کہا ہو، مگر نواب صاحب راجا صاحب کی بات کا دوٹوک جواب نہ دے کر بڑی خوبصورتی کے ساتھ جواب میں کہتے ہیں کہ ان کی صرف دو شرطیں ہیں۔ اگر بیرسٹر صاحب ان کو مان لیں تو مجھے شادی کرنے پر اعتراض نہیں۔ اول یہ کہ وہ مسلمان ہو جائیں۔ دویم یہ کہ وہ میری اکلوتی بیٹی ہے، میں گھر داماد بنا لوں گا۔ شاید یہ سوچا ہو گا کہ وہ ایسا ہرگز کرنے پر راضی نہ ہوں گے کہ شادی شدہ ہیں۔ ایک بیٹے کے باپ اور خود اکلوتا ہونے کی وجہ سے اگر مذہب بدلتے ہیں تو اپنے باپ کی لاکھوں روپے کی جائداد سے محروم ہو جائیں گے۔ بیرسٹر صاحب دونوں شرطوں کو قبول کر لیتے ہیں۔ اب نواب صاحب کے پاس انکار کرنے کی کوئی گنجائش نہ رہ گئی۔' ''

میں حق حیران ان کی طرف تکتی رہی کہ آخر یہ کیسی کہانی ہے، اس کا کوئی اور چھور بھی ہے۔ ان کی چمکتی آنکھیں جیسے کچھ مدّھم سی پڑ گئیں۔ بولیں، ''لو اب میرے

بہت سے خط گڈمڈ ہوگئے ہیں۔ بیرا کھانا بھی لاتا ہوگا۔ باقی باتیں زبانی سناتی ہوں:

''تارا ناتھ نے اس دن ایک خط اپنے والد کو اور ایک پریم کو لکھا کہ ان کو اب پریم کی دوستی اور ظرف کا امتحان لینا ہے کہ وہ کس طور سے ان کو دوسری شادی کی اجازت دیتی ہیں۔ وہ جانے کس دل گردے اور کس ظرف کی خاتون تھیں کہ خوشی خوشی اجازت ہی نہیں دی بلکہ یقین دلایا کہ وہ مطلق فکر نہ کریں جو مقام ان کے لیے دل میں ہے وہ ہمیشہ رہے گا۔ دوستی کا تقاضا ہے کہ اپنے دوست کو اس کی کمزوریوں کے ساتھ قبول کیا جائے۔ وہ ان کے بیٹے کے باپ بھی ہیں۔ یہ کچھ کم تو نہیں۔ اور تارا تو آسمان پر چمکا ہی کرے گا اور وہ اس کو دیکھا کریں گی! اور ساتھ یہ بھی لکھ بھیجا کہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ شادی میں ان کا اپنا کوئی نہ ہوگا۔ وہ خود بَری لے کر آئیں گی، بیٹا بھی ساتھ آئے گا۔ اصل میں پریم کو شاید اپنے ظرف اور دل کو بڑا ثابت کرنا مقصود ہوگا۔ دوسرے وہ اپنی آنکھ سے یہ دیکھنا چاہتی ہوں گی کہ وہ پری کیا حور پری ہے، جس کو دور سے چند بار دیکھ کر وہ ایسے لہلوٹ ہوے کہ اپنا مذہب، اپنا بیٹا، اپنی بیوی اور لاکھوں کی جائداد، اپنا شہر سب ہی چھوڑ دینے پر تیّار ہوگئے۔ سر آسوتوش بنرجی تو ایسے آگ بگولا ہوے کہ ساری جائداد بہو اور اس کے بعد پوتے کے نام کر کے بیٹے کو عاق کر دیا۔ مجھے پریم بدا نے لکھا کہ فلاں دن اور فلاں تاریخ کو بھوپال اسٹیشن پر میں ان کو ملوں اور ان کے ہمراہ شادی میں شرکت کرنے ریاست 'سکتی' چلوں۔ پریم کی اس حماقت خیز حرکت پرمیرا غصّے سے برا حال تھا۔ دل کرتا تھا کہ ان کے تارا کا گلا گھونٹ دوں لیکن خود میرے اپنے دل میں عجیب سی کیفیت تھی کہ اپنی دوست کا ظرف اور تاراناتھ کی گراوٹ اور پشیمانی کو اور اس عجوبہ لڑکی کو اپنی آنکھوں سے ذرا دیکھوں تو بھلا۔ دس دن بعد میں یہاں سے روانہ ہوئی۔ بھوپال پر پریم اسی انداز سے اتریں جو ہمیشہ ان کا رہا تھا۔ مسکراتی، مورنی کی سی چال، سادگی کے ساتھ بانکپن، بیٹے کی انگلی پکڑے ہوے (منوہر اس وقت چھ سال کا تھا)، چند ملازم اور آیا ساتھ میں، ڈھیر سارے سوٹ کیس۔

''دوسری ریل میں جب ہم بیٹھ گئے تو میں پریم سے لپٹ کر رو پڑی کہ آخر یہ حرکت کرنے کا تمھارا مطلب کیا ہے؟ وہ بڑی زور سے قہقہہ لگا کر ہنسیں اور بولیں، 'سروجنی، تم تو بیوقوف نکلیں۔ جب سو میٹھے نوالے کھا لیے ہیں تو ایک کڑوا ہنس کر خوشی خوشی کھا لینے میں بھی تو ایک مزا ہے، اور اب ہم تم اپنے اپنے انداز سے کوئی بڑی

نظم بھی لکھ سکیں گے۔'

''ریل 'سکتی' ریاست کے پلیٹ فارم پر رکی۔ تارا ناتھ کے ساتھ مہاراجا صاحب اور ان کے ولی عہد، اور بھی بہت سے لوگ موجود تھے۔ جس دستور کو بیوی شوہر کے پاؤں کو جھک کر ہاتھ لگائے، ہم دونوں نے کبھی نہ کیا تھا اور اس فعل کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، آج پریم نے وہ بھی کر ڈالا۔ مجھے تو حیرت اس پر ہوئی کہ تاراناتھ نہ تو شرمسار تھے اور نہ ہی ان کے بانکپن میں کوئی فرق تھا۔ بیٹے کو گود میں لے کر خوب پیار کیے اور بیوی سے بولے، 'تم نے بڑا اچھا کیا کہ سروجنی کو بھی ساتھ لے آئیں۔'

''دوسرے دن تاراناتھ ہمارے سامنے مسلمان ہوے اور بدرالدین صاحب بن گئے! اس کے بعد قاضی نے نکاح پڑھوایا۔ پھر ہم دونوں نے دلہن کو دیکھا۔ کبھی ہم دلہن کو دیکھتے اور کبھی ایک دوسرے کو۔ میں نے زندگی بھر اتنی خوبصورت لڑکی نہ دیکھی تھی۔

''پریم بدا نے ایک بڑا سا لوہے کا صندوقچہ پاس منگا کر دلہن کے سامنے زیورات کا ڈھیر کر کے جس حد تک پہنا سکتی تھیں زیور سر سے پاؤں تک پہنائے۔ تین سوٹ کیسوں کی طرف اشارہ کیا کہ ان میں ان کے لیے کپڑے ہیں۔ ایک چاندی کی تھالی جس میں مونگ، ماش، تیل اور چند اشرفیاں تھیں، سر پر سے گھما کر صدقہ اتار کر نواب صاحب کی ملازمہ کے ہاتھ میں دے کر کہا، 'یہ تم لوگ لے لو۔' پھر بیٹے کو پاس بلا کر نمسکار کروا کر ان کے پاؤں کو ہاتھ لگوا کر کہا، 'یہ آپ کا بڑا بیٹا ہے۔ یقین ہے کہ ہمیشہ آپ کا تابعدار رہے گا۔'

''دوسرے ہی دن ہم دونوں حیدرآباد آ گئے۔ بھئی اب تو تم کچھ سمجھیں؟ یعنی ہم دونوں اختر [حسین رائے پوری] کی نانی اور نانا کی شادی رچا کر آگئے۔'' میری نظریں ان کے چہرے پر گڑی جا رہی تھیں۔ پھر بولیں، ''حبیب الدین ان دونوں کے بیٹے اور اختر کی والدہ ممتاز النساء ان کی بیٹی تھیں۔'' میں اب بول پڑی کہ پھر حبیب الدین ''بنرجی'' کیوں کر ہوگئے؟

بیرا ٹرالی پر کھانا لے آیا۔ اس کو باہر بھیج کر مجھے پلیٹ میں کھانا نکال کر دیا۔ پھر اپنی پلیٹ میں ڈال کر بولنا شروع کردیا۔ ''پریم اور تارا کی دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ہر کام کرنے سے پہلے ان سے مشورہ لیا کرتیں۔ خط و کتابت برابر ہوتی۔ ہر نئی نظم اور مضمون میاں کو پہلے بھیج کر دریافت کرتیں، کیا اس کو چھپنے دوں؟ تاراناتھ ـــ بلکہ یوں کہو کہ بدرالدین صاحب پر میرے منہ سے ہمیشہ تاراناتھ ہی نکلتا رہا تھا ـــ وہ سال میں

چار پانچ بار کلکتہ کا پھیرا لگا آتے۔ مگر ان کے باپ نے کبھی بیٹے کی شکل نہ دیکھی اور نہ ہی ادھر سے کوئی اصرار کیا گیا۔ پریم نے اپنے بیٹے منوہر کے دل میں باپ کے لیے محبت کوٹ کوٹ کر بھر دی۔ باپ کا احترام اور عزّت کرنی سکھائی۔

''پریکٹس کی خاطر 'سکتی' سے رہائش ناگپور میں اختیار کی تو نواب برہان الدین صاحب نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور ناگپور آگئے۔ تاراناتھ بلکہ بدرالدین کی پریکٹس خوب زوروں پر چلی۔ سال بھر بعد حبیب الدین پیدا ہوے، دو سال بعد اختر کی والدہ ممتاز النساء۔

''منوہر جب آٹھ سال کا ہوگیا تو میاں سے اجازت لے کر شیلانگ پرنس کالج کے اسکول اور بورڈنگ میں داخل کر دیا۔ دوسرے سال میری دوست پریم پر قیامت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا کہ منوہر نے چند دوستوں کے ساتھ مل کر آئس کریم کھائی۔ اس میں کسی ولی عہد کے لیے زہر ملایا گیا تھا۔ جن پانچ لڑکوں نہ مل کر کھائی تھی، سب ہی مر گئے۔ یوں بیچارا منوہر نو سال کی عمر میں فوت ہوگیا۔ بدرالدین صاحب فوراً کلکتہ پہنچے۔ پریم کی دلداری کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ میں خود بھی اپنی دوست کے غم میں شریک ہونے کلکتہ آگئی تھی۔ بھئی پریم بدا بھی کیا ہستی تھی۔ اس عظیم غم کو دل پر کس انداز سے اٹھایا۔ نہ رونا تھا نہ آنسو تھے اور نہ اظہارِ غم کے الفاظ۔ ہر موضوع پر اسی طرح مسکرا مسکرا کر بات کرنا۔ بیٹے کا ذکر اشارے کنائے سے بھی نہ کرتیں۔ دل خون کے آنسو بہاتا ہوگا، مگر وہ پھر بھی ہنس ہنس کر باتیں کرتیں۔ بیرسٹر صاحب بار بار آبدیدہ ہو جاتے تو کہتیں، 'دیکھو تارا ایک عام انسان والی کمزوری تو خدارا نہ دکھاؤ۔ دنیا میں ہر آنے والا دیر سویر جاتا ضرور ہے۔'

''تین سال بعد پریم نے میاں کو لکھا اب تو خدا کے فضل سے تمھارے پاس ایک بیٹی بھی آگئی ہے۔ اپنی دلہن بیگم سے پوچھو کیا وہ حبیب کو مجھے گود لینے کی اجازت دے سکتی ہیں؟ تو اختر کی نانی صاحبہ نے اپنے والد سے مشورہ کیا اور بڑی خوشی خوشی اجازت دے دی۔ وہ بڑی عقل مند خاتون ہوں گی کہ ایک اتنی عظیم اور نامور خاتون کے ہاتھوں ان کا بیٹا پروان چڑھے اور پھر کروڑوں کا وارث بھی ہو۔ پریم خود اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھیں، جن کے بے شمار چائے کے باغات اور کلکتہ میں جائداد تھی۔ مجھے لکھا کہ میں ان کے ساتھ ناگپور چلوں اور میں چل پڑی۔ گود لینے کی چند رسومات ادا کیں۔ یہ لکھ

کر عہد نامہ دیا کہ لڑکے کو پوری اسلامی تعلیم دلوائیں گی اور سال میں ایک بار ناگپور آئے گا۔ پریم کی بھی ایک شرط ہوئی کہ حبیب الدین کے نام کے آگے خاندانی نام 'بنرجی' لکھا جائے۔ اس پر ان کو کوئی اعتراض نہ ہوا۔ اسی دوران میں پریم کے والدین انتقال کر چکے تھے اور وہ اپنی جائداد کی واحد وارث ہو چکی تھیں۔ ہم دونوں چار دن ناگپور رہے اور بیگم صاحبہ کو اچھی طرح دیکھا اور پَرکھا۔ کتنی شائستہ، کس قدر روشن دماغ اور عالی ظرف۔ کیوں نہ ہو نواب برہان الدین کی بیٹی جو تھیں۔ ان کے حسن میں نکھار اب اور دوچند ہوگیا تھا۔

''پریم نے اپنے جائے بیٹے کو اتنا وقت اور توجہ نہ دی ہوگی نہ ایسی دیکھ ریکھ کی ہوگی۔ لڑکے کو کسی بھی اسکول یا بورڈنگ نہ بھیجنے کا عزم کرلیا تھا کہ کہیں اس کو بھی کوئی زہر نہ دے دے۔ اس لیے انگلستان سے ایک ٹیوٹر بلوا کر تعلیم دِلوانا شروع کی۔ وہ جو تم نے اس دن ان کا خط پڑھنے کے بعد مجھ سے کہا تھا کہ 'خط انگریزی میں تھا۔ بے حد اعلیٰ زبان اور لکھائی تھی۔' مجھے خوب یاد ہے کہ حبیب جب انگریزی بولتے تو درحقیقت کسی انگریز ہونے کا شبہہ ہوتا، کیوں کہ صورت شکل اور رنگت بے حد صاف۔ لباس ان کے انگلستان سے آتے تھے۔ بھئی وہ تو جب نہاتے، پانی کے بھرے ہوے ٹب میں آدھی بوتل کولون کی ڈلا کرتی تھی۔ کئی ملازم ان کی ذات کے لیے علیحدہ تھے۔ سواری کے لیے ایک گھوڑا اور بگّھی! بنگلہ اور ہندی کے لیے ماسٹر اور اردو اور قرآن پڑھانے کو مولوی آتے۔ کیسے کیسے ناز اور نخرے اٹھائے جاتے۔ وہ جو حبیب نے اختر کو خط میں لکھا کہ سوتیلی ماں کے لاڈ اور دلار میں تباہ اور برباد ہوگئے، تو سچ ہی تو کہا۔ کلکتہ میں حبیب کو جو کچھ پڑھایا جاتا اور سکھایا جاتا تھا بیگم صاحبہ اپنی بیٹی یعنی اختر کی والدہ کو سِکھوانے کے جتن کرتیں۔ ان کا بیٹا اور ہماری بیٹی جیسے کمپٹیشن کے لیے تیار کیے جا رہے ہوں۔

''اختر کی والدہ کو قدرت نے بھائی سے زیادہ ذہن عطا فرمایا تھا۔ اردو، ہندی اور انگریزی میں کم عمری سے ہی مضامین لکھنا شروع کیے۔ انگریزی پڑھانے مشن کی دو گورنس مقرر کرلی تھیں۔ ہاں بنگلہ زبان پڑھانے والا زیادہ دن کے لیے میسّر نہ ہوا۔ اس طرح بنگالی کی صرف شُد بُد ہی ہو سکی۔ چند سال بعد نواب برہان الدین انتقال کر گئے۔ اختر کی والدہ کو اپنے نانا سے بہت زیادہ لگاؤ تھا۔ پھر سال بھر بعد بدرالدین صاحب پینتالیس برس کی عمر میں پیضے کے موذی مرض میں دو تین دن میں چٹ پٹ ہوگئے۔ بیچاری بچی

ابھی دس ہی سال کی تھی کہ بِن باپ کی ہوگئی۔ پریم اپنے بیٹے حبیب کو لے کر فوراً ناگپور آگئیں اور پورے سوا مہینے وہاں رہیں۔ بیگم صاحبہ اور پریم میں بڑا قرب اور دوستانہ اس درمیان میں ہوگیا کہ ہر معاملے میں پریم سے صلاح مشورہ کرتیں۔ ممتاز النساء کو بہت کچھ نانا کی طرف سے اور بڑی جائداد والد کی طرف سے ملی اور عمر اس قدر کم۔ پریم کے مشورے سے سب کورٹ آف وارڈ میں کروادی گئی۔ اختر کی والدہ کا اس ذرا سی عمر میں ذہانت قابلیت اور نشست و برخاست کا انداز حیرت انگیز تھا۔ پریم اس بچی کے لیے اپنے دل میں بہت سا پیار اور بہت سی امیدیں لے کر واپس کلکتہ جاتے وقت چند روز کو میرے پاس آئیں۔''

میں دم بخود یہ عجیب کہانی سنتی رہی۔ ہم دونوں ہی کھو سے گئے۔ میری نظر گھڑی پر پڑی اور گھبرا کر کھڑی ہوگئی کہ دو بج چکے، مجھے فوراً گھر جانا چاہیے ورنہ مولوی صاحب اور اختر مجھے پھر ان کے پاس آنے کی اجازت نہ دیں گے۔

''جمیل [جالبی] بھائی، ایسا قصّہ کہانیوں میں تو پڑھنے کو شاید مل جائے، پر سچ مچ ایسا کیسے ممکن ہوا؟ پریم بدا دیوی تو حقیقت کی دیوی تھیں۔''

میں گھر آ کر لیٹ گئی۔ تصورات کے ایسے گورکھ دَھندے میں پھنس گئی کہ شام کا آنا اس وقت تک معلوم ہی نہ ہوا جب تک اختر کی بھاری سی آواز نے مجھے چونکا نہ دیا۔ کھڑی ہوگئی مگر کچھ سہمی سہمی نظروں سے اختر کو دیکھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں نے کوئی چوری کی ہے۔ جس ماضی کو یہ خود تو قفل تالے میں بند کر چکے اور میں اس کو اس قدر قریب سے دیکھ آئی۔ پوچھا، ''خیر تو ہے؟ مجھے اس قدر بھونچکا ہو کر کیوں دیکھ رہی ہیں، جیسے میرے دو سینگ نکل آئے ہوں؟ معلوم ہوتا ہے سروجنی نائیڈو نے بڑی فلسفیانہ اور شاعرانہ گفتگو کی ہے جو آپ سے ہضم نہیں ہو رہی ہے۔ چلیں، چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔''

بشکریہ، ''ہم سفر'' (کراچی: دانیال، ۱۹۹۶)، صفحہ ۱۳۳ تا ۱۴۴